گوپال مِتّل

لاہور کا جو ذکر کیا
(کچھ آپ بیتی، کچھ جَگ بیتی)

[مشہور شاعر اور رسالہ ’’تحریک‘‘ (دہلی) کے مدیر جناب گوپال متّل صاحب مرحوم کی یادداشتوں سے منتخب یہ نوادِرات ضرور قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ یہ جس سادہ، شستہ، براہ راست، اور اثر انگیز اردو میں لکھی گئی ہیں اُس پر جتنا فخر بھی کیا جائے کم ہے۔ — مدیر]

’’شاہکار‘‘ سے وابستگی سے کچھ پہلے ہی میں نے کچھ فرانسیسی افسانوں کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔ ہندوستانی ماحول کے مطابق میں نے ان کے پلاٹ میں بھی کچھ تبدیلی کر دی تھی اور عنوان بھی بدل دیے تھے۔ میں نے انھیں جمع کر کے چودھری نذیر کو دے دیا جسے انھوں نے ’’پھول اور کانٹے‘‘ کے نام سے مکتبۂ ادبِ لطیف سے شائع کردیا۔ اس پر مولانا تاجور نے تقریظ بھی لکھ دی، جس میں انھوں نے میری نظم و نثر کی کافی تعریف کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی لکھا کہ میں اگر چاہتا تو ان افسانوں کو طبع زاد کہہ کر پیش کرسکتا تھا لیکن میرے اس اعتراف نے کہ یہ افسانے اوریجنل نہیں ترجمہ ہیں، مجھے ان تمام افسانہ نگاروں سے ممتاز کردیا ہے جو پڑھنے والوں کی ’’ہمہ رَس بے خبری‘‘ پر بھروسہ کر کے ترجمہ شدہ افسانوں کو اوریجنل کی حیثیت سے پیش کر دیتے ہیں۔

یہ کام ان دنوں کافی وسیع پیمانے پر ہوتا تھا اور قاضی عبدالغفّار اس سلسلے میں خصوصیت سے بدنام تھے۔ باقی افسانہ نگار بھی دوسرے افسانہ نگاروں کی متاعِ فکر کو اپنا مال سمجھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے اور موپساں ان کا ہدفِ خصوصی تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ کرشن چندر نے موپساں کے ایک افسانے کی مجھ سے بڑی تعریف کی تھی۔ اس کا پلاٹ کچھ اس قسم کا تھا کہ مہاجرین کا ایک قافلہ سرحد کو عبور کرنا چاہتا ہے لیکن سرحد پر جو افسر متعیّن ہے وہ قافلے کو سرحد پار کرانے کی قیمت طلب کرتا ہے۔ قیمت یہ ہے کہ قافلے کی ایک لڑکی اپنی عزّت اسے دے دے۔ قافلے والے ایثار اور قربانی کے نام پر لڑکی کو ایسا کرنے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی

سرحد پار ہو جاتی ہے وہ اس ''آبرو باختہ'' لڑکی سے حقارت کا سلوک شروع کردیتے ہیں۔ میں اور کرشن چندر کئی دن تک اس افسانے کا ذکر کرتے رہے پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن ایک دن کرشن چندر نے مجھے اپنا تازہ افسانہ سنایا جس کا عنوان غالباً ''پنڈارے'' تھا۔ اس کے اور موپساں کے افسانے کے پلاٹ میں نمایاں مشابہت تھی۔

دیوندر سَتیارتھی اس سلسلے میں ایک بار بے قصور ہی مارے گئے۔ ان کی یہ دیرینہ عادت ہے کہ وہ دوستوں کی بات چیت میں سے افسانے کا پلاٹ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کی تشکیل کے معاملے میں بھی جہاں کہیں سے ممکن ہو استفادہ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی اس عادت کے پیشِ نظر کنہیّا لال کپور، ہنس راج رہبر اور پرکاش پنڈت نے ان کے خلاف ایک ایسی سازش کی جس نے انھیں بری طرح رُسوا کیا۔

ایک دن علی الصبح ستیارتھی کنھیا لال کپور کے گھر پہنچے تو کپور نے چائے وغیرہ سے ان کی خاص طور پر تواضع کی اور چائے نوشی کے دوران میں برسبیلِ تذکرہ یہ بھی کہا کہ رات ان کے ذہن میں ایک پلاٹ آیا ہے اگر وہ افسانہ نگار ہوتے تو ضرور افسانہ لکھتے۔ ستیارتھی کے اصرار پر انھوں نے بتایا کہ پلاٹ کچھ اس قسم کا ہے کہ ایک کوچوان کا جوان لڑکا مر جاتا ہے۔ وہ غم کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کسی ہمدرد کی تلاش میں ہے جو اسے نہیں ملتا۔ ستیارتھی یہ سُن کر پھڑک اُٹھے اور افسانہ لکھنے پر آمادہ ہوگئے۔ وہاں سے اٹھ کر ستیارتھی، پرکاش پنڈت سے ملے۔ اس نے بھی ان کی خوب آؤبھگت کی اور سرسری طور پر پوچھا کہ کیا کوئی نیا افسانہ لکھ رہے وہ۔ ستیارتھی نے پلاٹ کا ذکر کیا تو پرکاش پنڈت کہنے لگے کہ ہاں پلاٹ تو خوب ہے۔ اسے آگے بڑھانا بھی کچھ مشکل نہیں، مثلاً یہ کہ کوچوان اپنے بیٹے کی موت کا ذکر اپنے تانگے کی سواریوں سے کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اس بات پر توجّہ نہیں دیتیں۔ سوال افسانے کے اختتام کا رہ جاتا ہے، یعنی یہ کہ کوچوان اپنا غم کسے سُناتا ہے اور اس کا ہمدرد کون بنتا ہے۔ ظاہر ہے کہ افسانہ تم لکھ رہے ہو میں نہیں اس لیے اختتام تمھیں کو ڈھونڈنا ہوگا۔

شام کو ستیارتھی نے کنھیا لال کپور اور پرکاش پنڈت سے حاصل کردہ مواد ہنس راج رہبر کو سنایا اور اختتام پر بحث ہونے لگی۔ رہبر دریائے فکر میں ڈوب گئے اور پھر یکایک پکارے کہ موتی انھیں مِل گیا ہے۔ کوچوان اپنا غم گھوڑے کے کان میں کہتا ہے۔ ستیارتھی پھڑک اٹھے۔ اب افسانہ مکمّل ہوگیا تھا اور صرف اسے لفظوں کا جامہ پہنانا باقی

تھا جو ان کے لیے چنداں دشوار نہیں تھا۔

افسانہ لکھ کر ستیارتھی نے مجلسِ اربابِ علم میں سنایا جہاں لکھنے والوں کی بری طرح گت بنتی تھی۔ انھوں نے افسانہ ختم کیا ہی تھا کہ چاروں طرف سے ان پر چوری کا الزام لگنے لگا۔ ستیارتھی نے قدرتی طور پر پُرزور احتجاج کیا لیکن اعتراض کرنے والوں نے ثابت کردیا کہ جس افسانے کو انھوں نے اپنا کہہ کر سنایا ہے وہ اصل میں چیخوف کی تصنیف ہے۔ ستیارتھی سمجھ گئے کہ ان کے دوستوں نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ چور نہ سہی لیکن چوری کا مال برآمد تو انھی کی جھولی سے ہوا تھا۔

جلسہ گاہ سے باہر نکلے تو ستیارتھی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ اپنا غصّہ کس پر اُتاریں۔ کپور مزاح ہی نہیں بلکہ بری بھلی تنقید بھی لکھتے تھے۔ ویسے بھی وہ کارآمد تھے، لہٰذا انھیں معافی دے دی گئی۔ پرکاش پنڈت کی افادیت کچھ زیادہ نہ سہی لیکن وہ منہ پھٹ بہت تھے۔ ایک کی دو سناتے، لہٰذا ان کے معاملے میں بھی درگزر ہی سے کام لیا گیا۔ اب لے دے کے ہنس راج رہبر رہ جاتا تھا۔ ''نزلہ بر عضوِ ضعیف می ریزد'' کے مقولے پر عمل کرتے ہوے ستیارتھی نے انھی کے گھر کا رُخ کیا۔ رہبر کے وہ اَڑھائی روپے کے مقروض تھے۔ غالباً اس سے کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر خریدتے رہے تھے۔ جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اڑھائی روپے کا یہ قرض ادا کردیا اور اس طرح اپنی مساویانہ حیثیت قائم کرنے کے بعد اپنا سارا غصّہ ان پر جھاڑ کر واپس آگئے۔ [صفحہ ۲۵ تا ۲۸]

* * *

چراغ حسن حسرت اس مجلس کے میر تھے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ ''الہلال'' میں کام کیا تھا۔ ''زمیندار'' میں وہ ''فکاہات'' کے عنوان سے مزاحیہ کالم لکھتے جس کی ان دنوں بڑی دھوم تھی۔ اس کالم میں اِتّحاد پارٹی کا انھوں نے جو قصیدہ لکھا تھا وہ زبان زدِ خاص و عام تھا:

تیرا یار نریندر ناتھ ـــ اِتّحاد پارٹی
سارے ٹوڈی تیرے ساتھ ـــ اِتّحاد پارٹی

اپنے اسی انداز میں انھوں نے پنجاب کا سیاسی جغرافیہ بھی لکھا تھا، جس میں

پنجاب کی سیاسی شخصیتوں پر بہت دلچسپ چوٹیں کی تھیں۔ اردو زبان پر انھیں بلا کا عبور تھا۔ کچھ دیومالائی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ یہ کہانیاں انھوں نے ٹھیٹ اردو میں لکھی تھیں لیکن اگر اسی کتاب کو دیوناگری میں چھاپ دیا جاتا تو ہندی والے انھیں ہندی کا بڑا لکھاری ماننے پر مجبور ہو جاتے۔ ادب اور سیاست میں ان کی معلومات بھی وافر تھیں۔ قدرتی تھا کی ایسا آدمی مبتلائے زُعم ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے سوا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور قول و فعل کے ہر تضاد کو اپنے لیے روا رکھتے تھے۔ یہ ان کا عام شیوہ تھا کی رمضان کے دنوں میں ''عرب ہوٹل'' میں چائے کی پیالی سامنے رکھ لیتے، چُسکیاں لیتے رہتے اور روزے کے فضائل بیان کرتے جاتے۔ ان کے کمال کے سبھی معترف تھے اس لیے کوئی حرف گیری نہیں کرتا تھا۔

میری ان کی ملاقات کی ابتدا نوک جھونک سے ہوئی۔ مجھے ان دنوں نزلہ اکثر رہتا تھا۔ کسی نے مجھے بہکا دیا کہ دائمی نزلے کا تیر بہدف علاج کسی مشہور ڈاکٹر نے یہ بتایا ہے کہ آدمی سر پر پگڑی باندھنے لگے۔ میں نے اس نُسخے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ انھی دنوں ''عرب ہوٹل'' میں میری آمد و رفت شروع ہوئی۔ دوسرا تیسرا دن تھا کہ حسرت صاحب نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا کر کہا، ''جوتشی جی! ذرا میرا ہاتھ تو دیکھ دیجیے۔'' میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور چند منٹ غور سے دیکھنے کے بعد جواب دیا، ''حسرت صاحب میں مجبور ہوں۔ آپ نے تو کثرتِ استعمال سے اپنے ہاتھ کی لکیریں ہی مٹا ڈالی ہیں۔'' ''عرب ہوٹل'' کے قلندر غالب کے طرفدار سہی لیکن سخن فہم بھی تھے۔ میرے فقرے پر اس زور کے قہقہے پڑے کہ چھت ہِل گئی۔ خود حسرت صاحب نے بھی بات کا مزہ لیا اور اس کے بعد ان کی میری اچّھی خاصی دوستی ہوگئی۔

عبد المجید بَھٹّی کا دفتر ''عرب ہوٹل'' کے پاس ہی تھا۔ پہلے وہ بچّوں کی نظمیں لکھا کرتے تھے، ان دنوں بالغانہ نظمیں لکھنے لگے تھے۔ وہ ''عرب ہوٹل'' میں بھی بیٹھتے تھے اور کبھی کبھی لاؤلشکر کو اپنے دفتر میں بھی لے جاتے تھے۔ مادّی طور پر وہ خوشحال نہیں تو ہم سب کے مقابلے میں آسودہ تر ضرور تھے۔ دوستوں کی دعوتیں کرنے میں فیّاض تھے اور بہت مرنجاں مرنج اور خلیق واقع ہوے تھے۔ شاید ان کے ضبط کا امتحان لینا مقصود تھا۔ کچھ لوگ ان پر موقع بے موقع فقرے کَستے رہتے تھے۔ لیکن ان کی پیشانی پر بَل نہیں آتا تھا اور ہر فقرہ وہ خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے تھے۔ شروع شروع میں جواب نہیں دیتے

تھے، پھر ہنسی مذاق میں دوسروں کا ساتھ بھی دینے لگے۔

''عرب ہوٹل'' کے حاضرباشوں میں ایک انتہائی دلچسپ شخصیت باری علیگ کی تھی جو خود کو اشتراکی ادیب لکھتے تھے۔ اصلی نام غالباً عبدالباری تھا۔ اشتراکی بنے تو عبدیت پر سے ایمان اٹھ گیا اور صرف باری رہ گئے۔ ''کمپنی کی حکومت'' کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو کئی بار چھپی۔ کچھ کتابچے بھی انھوں نے لکھے تھے اور مختلف اخباروں میں کام بھی کرتے رہے تھے۔ بڑے ہی آزاد خیال اور قلندر صفت آدمی تھے۔ جب وہ ''شہباز'' میں کام کرتے تھے تو کچھ دوستوں نے کہا کہ اگر وہ پینٹ اُتار کر ''شہباز'' کے دفتر سے ''عرب ہوٹل'' تک آئیں تو ایک شاندار دعوت ہوگی۔ باری واقعی تیّار ہوگئے اور جو کہا تھا کر گزرے۔ اس کا طریقہ انھوں نے یہ اختیار کیا کہ چلتے چلتے سینہ کوبی کرتے جاتے تھے اور ''یا علی! یا علی!'' کے نعرے بھی لگاتے جاتے تھے۔ راہگیروں نے مجذوب سمجھ کر نظرانداز کردیا اور وہ شرط جیت گئے۔

پنجابی نیشنلزم کے باری زبردست داعی تھے۔ اردو کے ادیب ہونے کے باوجود وہ اردو زبان کو خارج البلد کردینا چاہتے تھے۔ تَرنگ میں ہوتے تو کہتے جب کوئی پنجابی اردو بولتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہو۔ شروع شروع میں وہ لیگ کے مقابلے میں کانگرس کی حمایت کرتے رہے لیکن پھر دونوں ہی سے بیزار ہوگئے۔ ان کا کہنا تھا کہ کانگرس اور لیگ جو ''غیر ملکی'' جماعتیں ہیں، پنجابیوں میں، جو واقعی ایک قوم ہیں، پھوٹ ڈالنا چاہتی ہیں۔ اہلِ پنجاب کو چاہیے کہ وہ ''اپنے ملک'' کے دروازے ان دونوں جماعتوں پر بند کر دیں، بلکہ بہتر یہ ہو کہ سیاست ہی سے توبہ کر لیں۔ سیاسی مباحث کو وہ کس حقارت سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب لیگ اور کانگرس کی بحث انتہائی عروج پر تھی اور ملک کے تقسیم ہونے کے آثار نظر آنے لگے تھے تو ہوٹل میں داخل ہو کر پہلا نعرہ یہ لگاتے تھے، ''آج کون فریق جیت رہا ہے؟'' اس کے بعد لیگ اور کانگرس کے حامیوں میں جو دھڑا کمزور ہوتا اس کی حمایت شروع کر دیتے۔

سیاسی بحث میں قلندروں کے درمیان تلخی پیدا ہوتے کبھی نہیں دیکھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ اپنے محدود دائرے سے باہر کی ہر چیز کو غیر حقیقی سمجھتے تھے۔ اگر کبھی کوئی ناواقفِ آدابِ قلندری محفل میں آدھمکتا اور کسی بات پر مشتعل ہو اٹھتا تو رنگِ محفل دیکھ کر اس کی طبیعت از خود اعتدال پر آجاتی تھی۔ احسان دانش کے ایک

شاگرد نے موچی دروازے کے پاس ''منزل'' کے نام سے ایک ریسٹوران کھول رکھا تھا، کبھی کبھی قلندروں کا قافلہ اُدھر بھی جا نکلتا۔ ایک دن محفل وہاں سَجی ہوئی تھی اور حسبِ معمول دنیا کی ہر چیز کا مذاق اُڑایا جا رہا تھا کہ یکایک ایک نوجوان پاس کی میز سے اٹھا اور خالی کرسی پربیٹھ کر جوتوں سمیت اپنے دونوں پاؤں قلندروں والی میز پر دے مارے۔ وہ خاکسار تحریک میں نیا نیا شامل ہوا تھا اور یہ دیکھ کر اسے بڑا اشتعال آیا تھا کہ یہ لوگ سیاسی رہنماؤں کا ذکر اس بے حُرمتی سے کر رہے ہیں۔ چھوٹتے ہی کہنے لگا، ''تم کفر بَک رہے ہو۔ میں تمھیں قتل کر دوں گا۔'' اس سے پوچھا گیا کہ آخر اسے یہ یقین کیوں ہے کہ وہ قاتل ہی ہوگا مقتول نہیں تو بولا،''میں سچّا مسلمان ہوں اگر قتل ہوا بھی تو جنّت میں جاؤں گا۔'' اس مرحلے پر میری رگِ ظرافت پھڑکی اور ملتجیانہ انداز میں اس سے کہنے لگا، ''صاحب، اس عمر میں جنّت میں نہ جانا۔ جنّتی آپ کو غلمان نہ بنا لیں۔'' اس فقرے پر قلندروں کا جو حال ہوا وہ تو ظاہر ہے لیکن اس نوجوان کا ردِّ عمل بھی مزید اشتعال کی بجائے محجوب سی ہنسی میں ظاہر ہوا۔ کوئی تین چار ہفتے کے بعد مجھے انارکلی میں ملا تو بالکل بدلا ہوا تھا۔ بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا، ''متّل صاحب! میں‌نے وہ سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اب شراب پیتا ہوں، گانا سُنتا ہوں۔'' یہ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ انتہا پسند طبائع جب ایک انتہا پسندانہ روش کو خیرباد کہتے ہیں تو فوراً ہی دوسری انتہا پر پہنچ جاتی ہیں۔ کیا انسان بنیادی طور پر کبھی بدلتا ہی نہیں؟

قلندر ادیب دنیا و مافیہا سے بیگانہ نشاطِ ناکامی میں سرشار تھے، زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ اپنی کج کُلاہی کی روش کو زندہ رکھا جائے۔ سماج سے ان کا رابطہ صرف اسی حد تک تھا جو جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے، یعنی پیٹ پالنے کے لیے کسی اخبار کے دفتر میں چھوٹی بڑی ملازمت کر لینا، کسی پبلشر کے لیے ترجمہ کر دینا یا کوئی کتاب یا مجموعہ مرتّب کر دینا۔ کامیابی کو یہ لوگ شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ یہ طے تھا کہ کامیابی ناجائز طریقوں ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ان میں کبھی کسی بات پر اتّفاق ہوتے دیکھا گیا نہ جھگڑا۔ اتّفاق اس لیے نہیں ہوتا تھا کہ سب لاعلاج حد تک انفرادیت کیش تھے اور جھگڑا یوں نہیں ہوتا تھا کہ ان کے نزدیک اس کی انفرادیت میں مداخلت تھی۔ حاصلِ زندگی یہ تھا کہ محفل میں کوئی چلتا ہوا فقرہ کہہ دیا جائے یا کوئی ادب پارہ لکھ دیا جائے۔ جو ادیب جتنا زیادہ غیر معروف ہوتا اتنی ہی اسے

زیادہ داد ملتی۔ یہ بھی ایک طرح سے ناکامی کی پرستش تھی۔

یہ اس زمانے کا کمال بھی تھا کہ گدڑیوں میں لعل مل جاتے تھے۔ لاہور کے گھٹیا ہوٹلوں میں بارہا ایسے گمنام لوگ ملے جو بہت عمدہ شعر کہتے تھے اور پارکوں میں ایسے لوگ جو گانے کا اتنا اچّھا سلیقہ رکھتے تھے کہ اگر ان کی تربیت ہو جاتی تو باکمال مغنّی ثابت ہوتے۔ اس زمانے میں فن برائے فن کا تصوّر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ کسی فن کو حاصل کر لینا ہی کوشش کی معراج تھی۔ صلہ اور داد ضمنی چیزیں تھیں بلکہ بعض لوگ تو انھیں غیر مستحسن بھی سمجھتے تھے۔ یہ ایسے فرہاد تھے جو دریوزۂ عشرت گہہِ خسرو کو اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھتے تھے۔ حکّام رَس شاعر اس زمانے میں‌بھی تھے لیکن ادبی حلقوں میں انھیں نہ تو قابلِ تقلید سمجھا جاتا تھا نہ مستحقِ رشک۔

مادّی اعتبار سے کامیاب ترین شاعر حفیظ جالندھری تھے۔ وہ ”شاہنامۂ اسلام“ لکھ کر معزّزین کی صف میں شامل ہوگے تھے اور اپنی کوٹھی بھی بنالی تھی، لیکن اپنی اس کامیابی پر غرّہ کرتے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ دوستوں سے دوستوں ہی کی طرح ملتے اور اپنے معزّز ہونے کا احساس زائل کرنے کے لیے اکثر ضلع جگت پر بھی اُتر آتے۔ شعر بھی وہ بدستور محنت سے کہتے تھے اور ”مستند ہے میرا فرمایا ہوا“ کے مقولے پر عمل پیرا نہیں تھے۔ قلندر ان سے بہر حال نالاں تھے اور اکثر یہی سمجھا جاتا کہ ان کی کامیابی میں صرف ان کی خوش گلوئی کو دخل ہے۔ اس عام غلط فہمی سے جس شاعر کو فائدہ پہنچا وہ احسان دانش تھے۔ احسان دانش خوش گلو تھے، بیحد محنتی تھے اور فقیرانہ وضع رکھتے تھے۔ کافی دنوں تک وہ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے رہے تھے اور خود کو مزدور شاعر لکھتے تھے۔ خوش گلوئی کے سوا باقی تمام باتوں میں وہ حفیظ جالندھری کی ضد تھے۔ اس طرح وہ ان تمام لوگوں کے لیے جو ناکامی کو مستحسن اور کامیابی کو ایک طرح کا جرم سمجھتے تھے، ہیرو بن گئے اور مشاعروں میں انھیں حفیظ کے مقابلے میں انتقاماً داد دی جانے لگی۔ حفیظ کے پرانے رقیب مولانا تاجور بھی احسان دانش کی مدد کو آگے بڑھے اور میزانِ نقد میں بھی انھیں احسان کا پلڑا بھاری نظر آنے لگا۔

احسان دانش، حفیظ کے کامیاب حریف اگرچہ نہ بن سکے لیکن یہ داد و ستائش ان کے کام ضرور آئی۔ اپنی کامیابی پر مطمئن ہو جانے کی بجائے وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہے کہ اپنے آپ کو دوستوں کی مدح و ستائش کا اہل ثابت کریں۔ انھوں نے زندگی کی ابتدا

واقعی مزدوری اور چوکیداری سے کی تھی۔ عِلم جتنا بھی انھوں نے حاصل کیا اپنی محنت سے۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ چوکیداری کے زمانے میں کئی کتابیں انھوں نے چاند کی روشنی میں پڑھیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ افلاس نے ان کی فطرت میں کَجی پیدا نہیں کی۔ وہ مردُم آزار نہیں بنے۔ دوستوں کے دوست تھے اور اپنا حقیقی قد بھی پہچانتے تھے۔ پیسہ بھی انھوں نے محنت ہی سے پیدا کیا۔ کتابیں لکھیں، کتب فروشی کی لیکن کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ وہ اپنے ابتدائی افلاس پر نادم نہیں تھے، لیکن افلاس کو خوبی بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بار ترقّی پسندی کے مفہوم پر بحث ہورہی تھی تو انھوں نے بے تکلّفی سے کہہ دیا تھا کہ میرے نزدیک ترقّی کا مفہوم یہ ہے کہ میں بوریے پر پیدا ہوا تھا لیکن قالین پر دَم توڑوں گا۔ [صفحہ ۳۳ تا ۳۸]

* * *

میں شاعروں کے ساتھ بالعموم شراب نہیں پیتا تھا۔ اختر شیرانی کے ساتھ تو ایک دو بار شریکِ جام ہوا بھی لیکن قریبی دوستی اور انتہائی موانست کے باوجود عدم کے ساتھ مے نوشی میں شرکت میں نے کبھی نہیں کی۔ شراب دیکھتے ہی ان پر ایسی وارفتگی طاری ہو جاتی تھی کہ وہ ہر حزم و احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ میری اپنی زندگی جس نہج پر بسر ہو رہی تھی اس میں تھوڑا بہت رکھ رکھاؤ ضروری تھا اور کُھل کھیلنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اپنے اور ان کے درمیان ایک محدود سا فاصلہ میں نے ہمیشہ باقی رکھا۔ انھوں نے بھی اس علم کے باوجود کہ میں زاہدِ خشک نہیں ہوں، مجھے اپنے ساتھ پینے کے لیے کبھی مجبور نہیں کیا۔

ایک مرتبہ شراب کے لیے مضطرب تھے اور حصول کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ میری جیب میں پیسے نہیں تھے لیکن گھر پر شراب کی نصف بوتل موجود تھی۔ میں انھیں یہ کہہ کر اپنے ساتھ لے گیا کہ میرے وعدے کو نصف سمجھنا۔ گھر پر مہمان آئے ہوئے ہیں، اس لیے شراب لے کر دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کھڑکی سے نیچے گرادوں گا۔ اگر تم اُچک لینے میں کامیاب ہو گئے تو تمھاری ورنہ دھرتی کی۔ یہ حادثہ پیش آئے تو شور نہ مچانا اور چُپ چاپ چلے آنا۔ عدم خلوص سے وعدہ کر کے میرے ساتھ ہو لیے لیکن جیسے ہی میرا ہاتھ باہر نکلتا ہوا نظر آیا وہ بے قابو ہو گئے اور زور سے چلّائے، ''متّل صاحب ذرا

احتیاط سے۔ بوتل ٹوٹ گئی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔‘‘ ان کی پکار گھر والوں نے بھی سن لی۔ پردہ فاش ہو چکا تھا، اب احتیاط غیرضروری تھی۔ میں نے کہا، ’’عدم صاحب، اب وعدہ نصف نہیں رہا۔ میں آپ کے لیے بوتل لے کر نیچے آرہا ہوں۔‘‘

شراب وہ ہر ماحول میں پی لیتے تھے اور صحبتِ ناجنس بھی ان پر گراں نہیں گزرتی تھی۔ غالباً اپنی داخلی کیفیات میں وہ اتنے مَگن رہتے تھے کہ بیرونی دنیا ان کے لیے کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ مجھے داتا گنج بخشؒ کے مزار کی طرف لے گئے۔ منزل ایک حجرۂ تاریک تھا۔ اختر شیرانی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان کے علاوہ کچھ عجیب الخلقت لوگ جمع تھے اور ایک لنگڑا ہارمونیم پر کچھ گارہا تھا۔ آواز اس کی اتنی بھیانک تھی کہ غالب کا مصرعہ ـــ ’’جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے‘‘ ـــ ایک نئے مفہوم کے ساتھ میرے ذہن میں گونجنے لگا۔ میں دو تین منٹ بعد وہاں سے کھسک آیا لیکن بعد میں ان کے ایک دوست نے جس کا نام غالباً قمر تسکین تھا مجھے بتایا کہ عدم اور اختر شیرانی اس حجرۂ تاریک میں اکثر جاتے تھے اور اس عزرائیل صفت مغنّی کی موسیقی پر عَالمِ سُرور میں سر دھنتے تھے۔

ان دونوں کے مزاج میں کوئی ایسی سرشارانہ کیفیت تھی جو زہر کو تریاق بنا دیتی تھی۔ شراب کا گھونٹ حلق سے اترتے ہی وہ حجرۂ تاریک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا اور اس کی جگہ چشمِ تصوّر میں وہ میکدۂ ازل ناچنے لگتا تھا جس میں حافظ و خیّام رقصاں اور غزل خواں ان کے منتظر تھے۔

اختر شیرانی کے لیے تو بعد میں باہر کی دنیا بالکل ہی بے حقیقت ہو گئی تھی اور ان کے ذہنی ہیولوں نے ان کے لیے ٹھوس شکلیں اختیار کرلی تھیں جن سے وہ خواب ہی میں نہیں بلکہ عالمِ بیداری میں بھی ہم کلام رہتے تھے۔ ان دنوں ان کی رہائش ایک گندی بستی کے شکستہ سے کمرے میں تھی۔ میں کبھی کبھی ملنے چلا جاتا تو مجھ سے پوچھتے کیا تمھیں کوئی آواز نہیں آرہی۔ پھر کہتے رات اس نے مجھے پوری غزل لکھوا دی۔ وہ بولتی جارہی تھی اور میں لکھتا جاتا تھا۔ اسے خللِ حواس کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن یہ خارجی ماحول پر داخلیت کی فتح بھی تو ہے۔ [صفحہ ۴۰ تا ۴۱]

* * *

ان دنوں مسلمان لیڈر اپنی قوم کو تجارت کی راہ پر گامزن کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ظفر علی خاں نے اس سلسلے میں ''اسلامی بازار'' کا منصوبہ بنایا تھا اور [عبد المجید] سالک کے دوست اور اردو کے مشہور ادیب امتیاز علی تاج ایک فلمی ادارہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ظفر علی خاں کی طبیعت نے جوش مارا اور وہ فلمی ادارے کی مخالفت میں زورِ قلم دکھانے لگے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک نظم کا مندرجۂ ذیل شعر حافظے میں رہ گیا ہے:

نئی تہذیب نے انڈے دیے لاہور میں آکر
اور اس کے نُقرئی بچّوں کی چوں چوں بن گئی ٹاکی

امتیاز علی کو تشویش ہوئی کہ مولانا کی مخالفت سے انھیں کاروباری نقصان پہنچے گا، چنانچہ سالک صاحب کی قیادت میں ایک وفد جس میں آنریری مسلمان پنڈت ہری چند اختر بھی شامل تھے مولانا کی بارگاہ میں باریاب ہوا اور انھیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ جب وہ خود چاہتے ہیں کہ مسلمان تجارت کی طرف راغب ہوں تو ایک مسلمان کاروباری ادارے کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں۔ مولانا کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ مسلمانوں کو لہو و لعب میں مبتلا کرنے کے خلاف ہیں۔ وفد کے ایک ممبر نے دورانِ گفتگو جب کہا کہ مولانا فلمیں تو آپ بھی دیکھ لیتے ہیں تو انھوں نے جوش میں کہا کہ ''فلمیں دیکھنا اور بات ہے اور بنانا دوسری۔ فلم دیکھنا تو معمولی بات ہے، میں تو رنڈی کا گانا سننے کے لیے بھی تیّار ہوں لیکن رنڈی مسلمان نہیں ہندو ہونا چاہیے۔'' اس پر سالک کی رگِ ظرافت پھڑکی۔ بڑے نیازمندانہ لہجے میں گویا ہوے: ''مولانا یہ کیا غضب کر رہے ہیں۔ اسی کاروبار پر تو ہماری اجارہ داری ہے، اسے بھی ہندوؤں نے سنبھال لیا تو ہمارے پاس کیا رہے گا۔''

* * *

ترقّی پسند ادب کا غَلغلہ لاہور میں ترقّی پسند مصنّفین کی پہلی کانفرنس کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا جو ۱۹۳۶ میں لکھنئو میں ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس طائفے کے جو نیازمندانِ لاہور کے نام سے مشہور تھا، ایک ممتاز رکن پروفیسر محمّد دین

تاثیر ترقّی پسند ادب کی تحریک کے اوّلین داعیوں میں سے تھے۔ تحریک کا پہلا منشور جو لندن سے شائع ہوا اس پر سجّاد ظہیر اور ان کے چار پانچ رفقا کے ساتھ تاثیر کے دستخط بھی تھے جو ان دنوں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے ہوے تھے۔ منشور پر ان کے دستخط دیکھ کر نیازمندانِ لاہور کے ادبی حلقے کے کچھ پرانے رکن اور کچھ نئے وابستگان، جو نیّت امام کی وہی ہماری کا نعرہ بلند کر کے ترقّی پسند ادب کا کلمہ پڑھنے لگے۔ نظریے کے بلند آہنگ مبلّغ چراغ حسن حسرت تھے جو اب اسلام کے ساتھ ساتھ ترقّی پسندی کے مفسّر بھی بن گئے تھے۔ یہ وہی چراغ حسن حسرت تھے جن پر ن۔ م۔ راشد نے ''اشتراکی مسخرے'' کے عنوان سے بعد میں اپنی نظم لکھی۔

ترقّی پسند مصنّفین پنجاب کے باہر کافی معتوب تھے اور انھیں کمیونسٹ سمجھ کر حکومت ان کے در پئے آزار بھی رہتی تھی۔ لیکن پنجاب میں عجیب بات تھی کہ ترقّی پسند ادب کے سرگرم حامی صرف یہی نہیں کہ سرکار کے معتوب نہیں ہوے بلکہ اس تحریک میں امتیاز ان کے دنیاوی فروغ کا باعث بن گیا اور انجمنِ ترقّی پسند مصنّفین کی سکریٹری شپ کو تو سرکاری ملازمت کے حصول کا زینہ سمجھا جانے لگا۔ انجمن کے پہلے سکریٹری سومناتھ چب تھے جو انگلستان سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ سکریٹری بننے کے کچھ ہی دن بعد انھیں سرکاری لازمت مل گئی۔ ان کے جانشین کرشن چندر بنے جن کی دوستی کا مجھے شرف حاصل تھا۔ کچھ ہی مدّت بعد وہ بھی آنکھوں میں آنسو بھر کر تشریف لائے اور یہ دردناک خبر سنائی کہ انھوں نے سرکاری ملازمت قبول کرلی ہے یا خود ان کے اپنے الفاظ میں خود کو فروخت کردیا ہے۔ وہ غالباً اس امّید میں آئے تھے کہ میں ان سے اظہارِہمدردی کروں گا اور بہت ممکن ہے کہ گالیاں بھی بَکنے لگوں گا لیکن میں نے مبارکباد پیش کی تو انھیں یک گونہ صدمہ ہوا۔ وہ اپنے جذبۂ شہادت کی تسکین چاہتے تھے۔ میں نے اپنی حماقت سے انھیں اس لذّت سے محروم کردیا۔

کرشن چندر مجھ پر واقعی مہربان تھے۔ وہ خود سلیقے کی زندگی بسر کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ میں بھی سلیقے کی زندگی بسر کروں۔ اپنے لباس کے بارے میں وہ کافی محتاط تھے اور مراسم قائم کرنے اور انھیں نبھانے کے آداب بھی انھیں آتے تھے۔ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ کامیابی کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے: اچّھا لباس اور رہنے کی معقول جگہ جہاں دوستوں کی مدارات کی جا سکے۔ ان دنوں ان کے ہیرو ملک راج آنند تھے جن کی کچھ

کتابیں یورپ میں چھپ چکی تھیں۔ ایک بار وہ آئے تو میں، کرشن چندر اور نریندر ناتھ سیٹھ (جو ان دنوں ڈرامے لکھا کرتے تھے اور آجکل سرکاری ملازمت میں ہیں) ان سے ملنے کے لیے سومناتھ چپ کی کوٹھی پر گئے۔ ملاقات کا وقت کرشن چندر نے طے کیا تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو نہ کوٹھی پر ملک راج آنند تھے اور نہ صاحبِ خانہ۔ ہم تینوں انتظار کرتے رہے اور وہ کافی دیر بعد آئے۔ اس دوران میں میں نے اور نریندر ناتھ نے کئی بار کرشن چندر سے، جو خود بھی کافی برہم ہو رہے تھے، کہا کہ ہم مزید انتظار نہ کریں لیکن کرشن چندر نے ہمیں روکے ہی رکھا۔

کنھیّا لال کپور، کرشن چندر کا اکثر مذاق اڑایا کرتے تھے کہ یہ کمیونسٹ ہونے کا مدّعی ہے لیکن جو کِریم استعمال کرتا ہے اس پر بورژوا لکھا ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ زیادتی بھی تھی کیونکہ کرشن چندر ان دنوں بورژوا زندگی بسر نہیں کر رہے تھے اور ان کا قیام ''ہندو ہوسٹل'' میں تھا جس میں کم استطاعت کے لوگ ہی رہتے تھے اور اچّھا لباس بھی وہ غالباً ان دنوں اپنے افلاس کو چھپانے یا اپنے لیے ترقّی کی راہیں نکالنے کے لیے ہی استعمال کرتے تھے۔ [. . .]

ترقّی پسند ادب کا ان دنوں شہرہ تو بہت تھا لیکن اس کا کوئی واضح مفہوم بیشتر ادیبوں کے ذہن میں نہیں تھا۔ ترقّی پسند مصنّفین کا اپنا جریدہ بھی ''نیا ادب'' کے نام سے شائع ہوتا تھا اور نیا ادب ایک ایسا پرچم تھا جس کے تَلے سبھی ادیب جو کسی نہ کسی پہلو سے جدّت پسندی کا ثبوت دیں یا جدّت پسندی کے مدّعی ہوں، جمع ہو سکتے تھے۔ یو۔ پی۔ میں ترقّی پسند ادب کے حامیوں کا چونکہ کانگرس سے رابطہ تھا اس لیے اس کا سیاسی پہلو نمایاں تھا۔ پنجاب میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ترقّی پسند میراجی اور سعادت حسن منٹو تک کو اپنی صف کا آدمی قرار دیتے تھے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ میراجی ان دنوں ''ادبی دنیا'' کے نائب مدیر تھے اور نئے لکھنے والے خواہ وہ ترقّی پسند ہوں یا نہیں اس جریدے کو حصولِ شہرت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ فرائڈیت اور مارکسیت کا باہمی تضاد بہت بعد میں ترقّی پسندوں کی سمجھ میں آیا۔ ان دنوں ان دونوں کے ڈانڈے ملے ہوے تھے۔ ترقّی پسندی کے بارے میں ان دنوں کتنا ابہام تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپندر ناتھ اشک کے نزدیک ترقّی کا مطلب یہ تھا کہ وہ کامیاب ترین افسانہ نگار بن جائیں۔ [. . .]

میں میراجی کی شاعری کا مدّاح تھا۔ ان کی تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھتا تھا اور جو لوگ ان کی نظموں کو مہمل بتاتے تھے، ان سے بحثتا بھی تھا۔ لیکن ذاتی سطح پر میرا ان کے ساتھ تعلّق رسمی علیک سلیک سے کبھی آگے نہیں بڑھا۔ گریز میری طرف ہی سے تھا۔ ان کی شاعری کا مدّاح ہونے کے باوجود ان کی حرکات کو برداشت کرنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ ان کے متعلّق لوگوں نے عجیب و غریب قصّے مشہور کر رکھے تھے جنھیں سن کر یہ گمان گزرتا تھا کہ وہ فاترالعقل ہی نہیں بلکہ ایک خطرناک آدمی بھی ہیں۔ ان قصّوں کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں میں نے کبھی چھان بین نہیں کی کیونکہ قیاس یہی کہتا تھا کہ جس شخص کی داڑھی اتنی میلی رہتی ہو، جو گرمیوں کے دنوں میں بھی اوورکوٹ پہنتا ہو اور کرسی پر اُکڑوں بیٹھتا ہو، وہ جو بھی کر گزرے کم ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہ اس وقت آئی تھی اور نہ اب آتی ہے کہ شاعر کے داخلی انتشار کا مظاہرہ اس کے خارجی اطوار میں کیوں ضروری ہے۔

جو نوجوان شاعری میں میراجی کی تقلید کرنے کی کوشش کر رہے تھے یا ان کے مدّاحِ خصوصی تھے، وہ بھی ہیئت کذائی کے معاملے میں ان کی پیروی کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ قیوم نظر سرکاری ملازم تھے اور یوسف ظفر، میاں بشیر احمد کے ''ہمایوں'' کے نائب مدیر تھے۔ یہ دونوں ہی معقول صورت آدمی تھے اور ان کے طور طریقے بھی عام آدمیوں سے مختلف نہیں تھے۔

میراجی کے ایک شاگرد مبارک احمد سے، جن کے متعلّق مشہور تھا کہ وہ اطوار میں بھی میراجی سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتے ہیں، تقسیم سے چند ہی ماہ قبل میری ملاقات ہوئی۔ میں نے ''ادبِ لطیف'' کی ادارت سنبھالی ہی تھی کہ وہ اپنی ایک نظم لے کر پہنچ گئے۔ میں نے نظم دیکھ کر سرسری سے لہجے میں کہا کہ نظم چھپ جائے گی۔ لیکن ان کے چہرے پر بے یقینی کے آثار تھے جیسے وہ سمجھتے ہوں کہ میں انھیں ٹرخا رہا ہوں۔ میں نے وہ نظم شائع ہی نہیں کی بلکہ شمارے کی ابتدا اسی نظم سے کی۔ نظم دیکھ کر وہ پھر آئے۔ میں سمجھا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں لیکن یہ بات نہیں تھی۔ ان کے خیال میں میں نے ان کی نظم سمجھے بغیر ہی شائع کردی تھی، اگر سمجھ لیتا تو اسے ہرگز شائع نہ کرتا کیونکہ اپنے مفہوم کے لحاظ سے یہ بڑی ہی قابلِ اعتراض تھی۔ اس نظم کو لے کر وہ میرے کئی پیشروؤں کے پاس آئے تھے اور سب نے اسے خطرناک اور ناقابلِ اشاعت سمجھ کر لوٹا دیا

تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر میں نے اس شائع کردیا تھا تو اس میں میری بے سمجھی کو ہی دخل ہو سکتا ہے۔

میں نے کہا، ’’مبارک احمد صاحب اس نظم کو میں سمجھ تو گیا ہوں لیکن غالباً اپنی نظم کا مفہوم پورے طور پر خود آپ نہیں سمجھے اور میرے پیشروؤں نے بھی غالباً اسے مسترد اسی لیے کیا کہ آپ اس کا مفہوم انھیں قبل از وقت بتا دیتے ہوں گے۔ آپ کی دانست میں اس نظم کا موضوع استلذاذ بالید ہے اور بہت ممکن ہے کہ جب آپ نظم لکھنے بیٹھے ہوں تو آپ کی نظم کا نقطۂ آغاز یہی ہو لیکن تخلیقی عمل کی گرفت میں آکر آپ کہیں سے کہیں پہنچ گئے اور جب نظم مکمل ہوئی تو اپنے موضوع سے بہت اونچی اٹھ چکی تھی۔‘‘
[صفحہ ۵۰ تا ۵۷]

* * *

اُستادانہ مہارت کے ساتھ ان کی شاعری میں جذبہ بھی تھا۔ یہ اجتماع بہت کم ہوتا ہے لیکن یہ سارا فضل و کمال ’’صرفِ پیمانہ ہوا وقفِ صنم خانہ ہوا۔‘‘

پیمانے اور صنم خانے کی بات یہاں صرف زینتِ سخن کے لیے ہے ورنہ پنڈت ہری چند اختر ان دونوں سے بے نیاز تھے اور میرا خیال ہے کہ جہاں ان کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو ان کی بذلہ سنجی اور ان کے لااُبالی پن نے نقصان پہنچایا وہاں ان کی غیر معمولی شرافت بھی ان کی تباہی کا باعث بنی۔ شرافت کو انھوں نے اپنا نصب العین بنا لیا تھا جس پر قربان ہو جانا ان کی زندگی کی معراج تھی۔ ان کے بیشتر دوست شرابی تھے۔ وہ ان کی محفلوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور شرابی جو حرکتیں بہک کر کرتے ہیں انھیں وہ ان کا ساتھ نباہنے کو بِن پیے ہی کرتے رہتے۔ ان کے پائے زہد کو لغزش تو کبھی نہیں ہوئی البتّہ اس مظاہرۂ پاکبازی سے ان کے اَنا کی تسکین ضرور ہوتی تھی اور کبھی کبھی تو ان کی پیشانی پر نورِشہادت بھی جھلک اٹھتا تھا۔

عورتوں کے معاملے میں بھی وہ غیرمعمولی طور پر پاکباز تھے۔ اپنے رنگین مزاج دوستوں کے ساتھ طوائفوں کے کوٹھے پرجانا ان کے نزدیک ممنوع نہیں تھا لیکن وہاں جا کر طوائفوں سے وہ کوئی شریفانہ قسم کا رشتہ ضرور قائم کر لیتے تھے۔ سانگ پبلسٹی کے شعبے کی ملازمت کے دوران میں ان کا واسطہ طوائفوں سے اکثر پڑتا تھا۔ یہ طوائفیں عملے

کے دوسرے اراکین کے لیے خواہ کتنی ہی مصیبت کا باعث بنی ہوں لیکن پنڈت جی اپنے حصارِ پاکدامنی میں مَگن رہے، بہن کا لفظ ہمیشہ ان کے لیے سَپر کا کام دیتا رہا۔ لاہور کی ایک طوائف البتّہ اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی ستم ظریف نکلی۔ یہ سانگ پبلسٹی میں ان کی ملازمت سے پہلے کی بات ہے۔ پنڈت جی دن کے وقت اس کے کوٹھے پر بیٹھے خوش گپّیوں میں مصروف تھے۔ عین اس وقت جب پنڈت جی کا پندارِ پاکبازی اپنے پورے عروج پر تھا اس ستم پیشہ نے کہا، ''پنڈت جی، آجکل لوگ بہت سیانے ہو گئے ہیں۔ تحریک یہاں سے حاصل کرتے ہیں اور کارروائی گھر جا کر!'' [صفحہ ۸۲ تا ۸۳]

* * *

دانشوری کا اسٹنٹ شاعری میں ترقّی پسندوں نے چلایا تھا۔ کوئی بھی کُلّیت کیش تحریک اس چیز کی روادار نہیں ہوسکتی جسے جنون و جذبہ کا نام دیا جاتا ہے۔ جنون و جذبے میں پُراسراریت ہوتی ہے اور پراسراریت کو کوئی آمرانہ نظام برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر یہ بھی تھا کہ اکثر شاعر جو ترقّی پسند تحریک کے گرد جمع ہوے، مُتشاعر ہی تھے اور جذبات کی نازک پرچھائیوں کی عکّاسی ان کے بس میں نہیں تھی۔ اپنے عِجز پر انھوں نے دانشوری کا پردہ ڈال لیا اور جو چیز ان کے بس میں نہیں تھی، اسے بورژوائی عیوب کی فہرست میں شامل کردیا۔ محبّت جو اردو غزل کا سدا بہار موضوع تھی، اب معتوب قرار پائی اور اس قسم کی نظمیں عام ہوگئیں جن میں شاعر اپنی محبوبہ سے گِڑگِڑا کے التجا کرتا تھا کہ وہ اپنے تقاضائے محبّت کو انقلاب آنے تک ملتوی کر دے۔ اس بات کا فیصلہ تو کوئی ماہرِنفسیات ہی کر سکتا ہے کہ اس قسم کی التجا میں انفعالِ جنسی کا کہاں تک دخل تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس قسم کے پوز سے ترقّی پسند شاعروں کے اَنا کی تسکین ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ خوش آئند تصوّر اور کیا ہو سکتا تھا کہ شاعر اپنے دَور کا اچّھا خاصا گلفام ہے اور یہ اس کا غیرمعمولی ایثار ہے کہ وہ کامیاب محبّت کے امکانات کو قومی مفادات پر قربان کر رہا ہے۔ ویسے اس دور کی کامیاب نظمیں وہی تھیں جن میں اپنی شکست کا اعتراف تھا اور نارسائی کا احساس کُھل کر سامنے آیا تھا۔ مثال کے طور پر مجاز کی نظم ''آوارہ۔'' اس نظم کا ہیرو تخریب کا خواب دیکھنے پر صرف اس لیے آمادہ ہوتا ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی تک اس کی رسائی ممکن نہیں۔

شاعری میں ترکِ عشق کے دعاوی کے باوجود اپنی عام زندگی میں ترقّی پسند شاعروں کا رویّہ غزل کے روایتی عاشق سے چنداں مختلف نہیں تھا، یہ ہر خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر آہیں بھرتے اور طبقاتی تضار کی دُہائی دیتے رہنے کے باوجود اونچی سے اونچی حویلی پر اپنے عشق کی کمند پھینکنے پر تیّار رہتے۔ اس قسم کے ایک عشق کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ عشق ساحر لدھیانوی، دیوندر ستیارتھی اور ایک نوجوان شاعر اشک نے جس کا پچھلے دنوں بمبئی میں انتقال ہوگیا، امدادِ باہمی کے اصول پر کیا تھا اور ان کے عشق کی ہدف تھی ایک فارغ البال شاعرہ۔ ستیارتھی کے پاس ان دنوں ایک کیمرہ تھا۔ ہر روز شاعرہ کی نئے نئے زاویوں سے تصویریں کھنچنے لگیں۔ ساحر کے پاس کیمرہ نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنی پذیرائی کے لیے یہ حربہ ڈھونڈھا کہ شاعرہ کے آنریری پبلسٹی ایجنٹ بن گئے۔ وہ اس کی نظموں کے اردو میں منظوم ترجمے کرتے اور مختلف جرائد میں انھیں چھپواتے ہی نہیں بلکہ ان پر تعریفی نوٹ بھی لکھواتے۔

شاعرہ کا دوپہر کا وقت نسبتاً فراغت کا تھا۔ یہ دوپہر کی دھوپ میں پیدل اس کی کوٹھی پر پہنچتے اور وہ یہ سمجھ کر کہ غریب دھوپ میں چل کر آئے ہیں، انھیں شربت پلا دیتی۔ یہ اس بے چاری کے ذہن میں کہاں تھا یہ اس شربت کو شربتِ وصل کا دیباچہ سمجھتے ہیں۔

اس شاعرہ سے نہ تو میں کبھی ملا ہوں اور نہ میں نے اسے دیکھا ہی ہے لیکن یہ تینوں حضرات چونکہ مجھے اپنا ایک ہمدرد رازداں سمجھتے تھے اور انھیں میرے حسنِ سماعت پر بھروسہ تھا اس لیے ہر روز کی روداد مجھے سناتے رہتے تھے۔ یہ جاننے کی کوشش میں نے کبھی نہیں کی کہ ان کی داستانوں میں حقیقت اور افسانے کا امتزاج کس تناسب سے ہے اور یہ کمال بھی مجھے حاصل ہے کہ میرے چہرے کی کیفیات سے کوئی داستان گو یہ اندازہ مشکل ہی سے لگا سکتا ہے کہ میں اس کی بات کو کس حد تک باور کر رہا ہوں۔

اس داستان میں لطف بھی بلا کا تھا۔ بالخصوص جب یہ ساحر یا اشک کی زبان سے بیان ہوتی تھی۔ یہ دونوں ستیارتھی سے کہیں زیادہ جانباز تھے اور ستیارتھی کی معیت میں دوپہر کے وقت شاعرہ کی کوٹھی پر جانے کے علاوہ رات بھر کوٹھی کا طواف بھی کیا کرتے تھے۔

اتّفاق سے ان دنوں میرے بیوی بچّے لاہور میں نہیں تھے اور میں ایک ایسے ہفت روزہ اخبار میں کام کرتا تھا جہاں میرے کوئی معیّنہ اوقاتِ کار نہیں تھے۔ صرف اتنی ذمّہ داری مجھ پر تھی کہ پرچہ وقت پر مرتّب ہو جائے۔ لہٰذا فراغت ہی فراغت تھی۔ صبح کہیں ہوتی اور شام کہیں اور لمحاتِ فرصت کو دلچسپ بنانے کا اس سے زیادہ اچّھا طریقہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ کسی کی داستانِ عشق سنی جائے۔

اشک ان دنوں لا کالج میں پڑھتے تھے اور ساحر کا بیشتر وقت بھی بالعموم وہیں گزرتا تھا۔ جب کافی شام ہوچکتی، ساحر اور اشک کہیں چل دیتے اور اگلی صبح ہی آتے۔ میں اس دوران میں اشک کے کمرے میں سوتا رہتا۔ صبح آکر وہ مجھے جگاتے اور نہانے دھونے اور ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اپنی داستان شروع کر دیتے۔ عجیب بات یہ تھی کہ الگ الگ دونوں ہی مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ وہ عشق کا سوانگ رَچا کر دوسرے کو بنا رہے ہیں۔ اگر یہ واقعی بنانا تھا تو رات بھر کی بیداری اس کی کچھ زیادہ ہی قیمت تھی۔ کبھی کبھی مجھے یہ شبہہ بھی گزرتا تھا کہ ساحر اس مقولے پر عمل کر رہا ہے کہ حصولِ شہرت کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اپنے متعلّق جتنی غلط فہمیاں پھیلا سکتے ہو پھیلا دو۔

ایک دن آسمان پھٹ پڑا۔ اس وقت تک ساحر پیسہ اخبار اسٹریٹ میں شورش کاشمیری کے کمرے میں منتقل ہوچکے تھے۔ شورش اکثر خود وہاں موجود نہیں رہتے تھے اس لیے محفل وہیں جَم جاتی تھی۔ اس دن میں وہاں پہنچا تو ستیارتھی، ساحر اور اشک شاعرہ پر بری طرح برس رہے تھے جس نے ''دولت کا سہارا لے کر'' اُن ''غریبوں کی محبّت کا مذاق اڑایا'' تھا۔ خیریت پوچھی تو پتہ چلا کہ آج جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو شاعرہ نے یہ کہہ کر کہ ''تصویر کھینچنے میں آپ حضرات کی جو فلمیں صَرف ہوئی ہیں، ان کی قیمت تو مجھ سے لے ہی لیجیے،'' انھیں حق الخدمت پیش کردیا تھا۔

دانشوری کے دعوے سے ترقّی پسند شاعروں اور ادیبوں کے اَنا کی تسکین اس طرح بھی ہوتی تھی کہ ان میں سے بیشتر کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے اور جدید علوم تک، جن پر عبور حاصل کیے بغیر دانشوری کا دعویٰ صرف مسخرہ پن ہے، ان کی رسائی یا تو تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو برائے نام۔ ان نیم تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کمیونسٹ پارٹی نےدانشور کا لقب دیا تو ان کی باچھیں کِھل گئیں اور جذبۂ احسان مندی کے تحت وہ اس

پارٹی کی ہر بات ماننے پر آمادہ ہو گئے۔ [صفحہ ۸٦ تا ۸۹]

* * *

سر عبد القادر ریٹائر ہو کر لاہور میں فروکش تھے۔ جیسا کی پہلے لکھا جا چکا ہے، ان سے ملاقات کا شرف مجھے اپنی ادبی زندگی کے آغاز میں حفیظ جالندھری کے توسّط سے حاصل ہوا تھا اور یاد پڑتا ہے کہ ادب کو پیشہ بنانے میں ان کے مشورے کو بھی دخل تھا۔ ریاض قادر سے مراسم بڑھے تو دل میں آئی کہ سر عبدل القادر سے پرانی ملاقات کی تجدید کی جائے۔ چنانچہ شام کو کبھی کبھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ یہ ملاقاتیں میرے لیے بڑی بصیرت افروز ثابت ہوئیں اور تاریخِ ادب کے ایسے کئی گوشے ظاہر ہوے جو بصورتِ دیگر میری نگاہوں سے ہمیشہ مخفی رہتے۔

ایک ملاقات میں‌انھوں نے ڈاکٹر اقبال کی زندگی اور ان کی شاعری کے پس منظر پر روشنی ڈالی اور ایسے نکات بیان فرمائے جو شارحینِ اقبال کی نگاہوں سے اس وقت بھی مخفی تھے اور اب بھی مخفی ہیں۔

اقوام متحدہ کے متعلّق ان کا ایک فارسی قطعہ ہے جس کے آخری دو مصرعے ہیں:

من ازیں بیش ندانم که کفن دزداں چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

اس پر شارحینِ اقبال نے استدلال کی ایک عمارت کھڑی کرلی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس انجمن میں ہندوستانی نمایندہ نامزد ہونے کے لیے اقبال نے بڑی ہی کوشش کی تھی۔ قرعۂ فال ان کی بجائے سرعبدل القادر کے نام نکلا تو انھیں اس پر کفن چوروں کی انجمن کا گمان گزرنے لگا۔ ان کے اس شعر

جو بے نماز کبھی پڑھتے ہیں نماز اقبال
بلا کے دیر سے مجھ کو امام کرتے ہیں

کے پیچھے بھی ایک حکایت ہے۔ یہ نماز لندن میں پڑھی گئی تھی۔ اقبال امامت کی آس لگائے بیٹھے تھے لیکن یہ آئی سرعبدل القادر کے حصّے میں۔

اقبال کے دو ترانے بہت مشہور ہیں ایک وطنی اور ایک مِلّی:

سارے جہاں سے اچّھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ان دونوں ترانوں کی نظریاتی اہمیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن سر عبدل القادر کا ارشاد تھا کہ یہ دونوں ہی ترانے فرمائشی تھے۔ پہلا ترانہ انھوں نے قوم پرستوں کی فرمائش پر لکھا تھا اور اس کا پہلا مصرعہ جرمن قومی ترانے کا لفظی ترجمہ ہے۔ صرف جرمنی کی جگہ ہندوستان کا لفظ رکھ دیا گیا ہے۔ اس ترانے کو شہرت ہوئی تو ملّت پرست دوستوں کی طرف سے ترانۂ مِلّی کے تقاضے شروع ہوے۔ اقبال نے انھیں بھی پورا کر دیا۔ [صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۰]

* * *

انارکلی پُرسکون سہی لیکن اندرونِ فصیل قیامت کا عالم تھا اور ہندوؤں کے بازار یکے بعد دیگرے جَلائے جا رہے تھے۔ جب تک ہندوؤں کو یہ خیال رہا کہ لاہور ہندوستان ہی میں رہے گا وہ وہاں ڈَٹے رہے لیکن جب لاہور کے بارے میں فیصلہ ہوگیا کہ وہ پاکستان میں جائے گا تو ان کے قدم اُکھڑ گئے۔ پھر اونچی سطح پر خواہ مضمر طور پر ہی سہی تبادلۂ آبادی کا فیصلہ بھی ہو گیا اور جانے والوں کے لیے سرکاری ٹرک مہیّا کر دیے گئے۔ اب ہندوؤں کے وہاں رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

میرا اٹھنا بیٹھنا چونکہ زیادہ تر مسلمانوں میں تھا اس لیے وہ مسلمان جو میرے ذاتی دوست نہیں تھے، مجھے مسلمان ہی سمجھتے تھے اور ایک بار ایک دلچسپ صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ ۱۵ اگست کو میں ''نگینہ بیکری'' میں صبح کا ناشتہ کر رہا تھا اور محفل جَمی ہوئی تھی کی یکایک دو تین غنڈہ صورت مسلمان داخل ہوے اور ہماری میز کے قریب ہی

بیٹھ گئے۔ پھر ہماری گفتگو میں بھی شریک ہو گئے اور اپنے قتل و غارت گری کے کارنامے فاتحانہ انداز میں سنانے لگے۔ ان میں سے ایک خصوصیت سے میری طرف مخاطب تھا اور ایک گردوارے پر حملے کی روداد سنا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گردوارے والوں کے پاس اسلحہ کافی تھا اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے متواتر گولیاں چلاتے رہے لیکن گولیاں آخر ختم ہوگئیں جس کے بعد وہ اور اس کے ساتھی دیوار پھاند کر گردوارے کے اندر گئے اور سِکھوں کو ایک ایک کر کے ذبح کر ڈالا۔

خدا جانے اس کا باعث میرا اپنے مسلمان دوستوں پر کامل اعتماد تھا یا دیوانگی کی کوئی ترنگ کہ میں نے اسے بتا دیا کہ جس شخص کو وہ اپنی روداد سنا رہا ہے وہ ایک ہندو ہے۔ اس کا لہجہ فوراً ہی بدل گیا۔ کہنے لگا کہ اگر پرسوں تم سے ملاقات ہوتی تو میں تمھیں ضرور قتل کر دیتا لیکن کل پاکستان قائم ہو گیا ہے، اب تم میرے مہمان ہو۔ میرے گھر چلو میں تمھاری تواضع کروں گا اور اگر کوئی تم پر انگلی اٹھائے گا تو اس کا سر کاٹ دوں گا۔ اپنی اَنٹی سے نکال کر اس نے مجھے کچھ گولیاں دکھائیں۔ کہنے لگا یہ ان میں سے چند گولیاں ہیں جو تمھارے بھائی بند ہم پر چلاتے رہے ہیں۔

قلندروں پر فسادات کا صرف اتنا اثر ہوا کہ اب میری آمد پر باری علیگ ''کافر آیا چُھری نکالو'' کا نعرہ بلند نہیں کرتے تھے، صرف ذمّی بنانے کی دھمکی دیتے تھے، جس پر میں کہا کرتا تھا، ''اَبے چل، تو خود کسی نواب ممدوٹ کا کمیرا ہوگا!'' یہ خوش فہمی ابھی قائم تھی کہ جو ہندو بھاگے بھی ہیں واپس آجائیں گے اور لاہور ویسا کا ویسا ہی رہے گا۔

لیکن اس خوش فہمی نے زیادہ دن ساتھ نہیں دیا۔ لاہور سے ہندو بھاگ ہی نہیں رہے تھے، باہر سے مسلمان آ بھی رہے تھے۔ لاہور کا نقشہ یکسر بدل رہا تھا۔ مجھے ذمّی بنانے کی دھمکی دینے کی بجائے باری اب اپنے اس ڈر کا اظہار کرنے لگا تھا: ''یار متّل، کہیں داڑھی نہ رکھنا پڑ جائے۔''

فسادات منظّم تھے یا خودرو، اس سلسلے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ فسادات اس لیے شروع ہوے کہ امرتسر کے بدمعاشوں نے لاہور کے بدمعاشوں کو چوڑیاں بھیجی تھیں۔ کچھ کہتے تھے کہ فسادات کی تنظیم مسلم لیگی لیڈروں نے کی ہے۔ لیکن بعض یہ بھی کہتے تھے کہ نواب ممدوٹ اور کچھ دوسرے مسلم لیگی مسجد مسجد جا کر امن کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں ہی باتیں

صحیح ہوں۔ شروع شروع میں انھوں نے فساد کو ہوا دی ہو اور جب فسادی حد سے تجاوز کر گئے ہوں تو انھیں باز رکھنے کی کوشش کی ہو۔ بہر حال یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اگر فساد منظّم ہیں تو اتنی دکانوں اور اتنے مکانوں کو جلایا کیوں جا رہا ہے جو بہر حال پاکستان کا اثاثہ ہیں۔

فسادیوں نے اس بستی پر جس میں پروفیسر برج نرائن رہتے تھے حملہ کیا تو انھوں نے یہی دلیل دے کر فسادیوں کو آتش زنی اور قتل و غارت سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ کہتے ہیں کہ پہلے فسادی پروفیسر صاحب کی بات مان کر واپس چلے گئے، لیکن وہی خود یا فسادیوں کی کوئی دوسری ٹولی دوبارہ آئی تو پروفیسر صاحب انھیں قائل کرنے میں ناکام رہے اور سب سے پہلے خود ہی قتل ہوے۔

پروفیسر برج نرائن عالمی شہرت کے ماہرِ اقتصادیات تھے۔ جہاں بیشتر ماہرینِ اقتصادیات یہ کہتے تھے کہ پاکستان اقتصادی طور پر کبھی مستحکم نہیں ہو سکے گا اور اس کا وجود بڑا ہی ناپائیدار ہے، وہاں پروفیسر برج نرائن نے اس نظریے کی حمایت میں متعدّد مضامین لکھے تھے کہ پاکستان اقتصادی طور پر خود کفیل ہونے کا اہل ہوگا۔ وہ پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کیے ہوے تھے اور ان کی بے تعصّبی کا کٹّر سے کٹّر مسلم لیگی قائل تھا۔ بہت ممکن تھا کہ اگر وہ زندہ رہتے تو پاکستان کے اقتصادی استحکام کا کام انھیں کے سپرد ہوتا لیکن قضا و قدر کو یہ منظور نہیں تھا۔

ان کی موت میرے لیے زبردست دھچکا تھی۔ وہ میرے استاد تھے اور میرے مزاج کی تشکیل میں ان کا بڑا دخل تھا۔ گھر والے لاہور رہنے کے لیے پہلے بھی تیّار نہیں تھے، اب میرے قدم بھی ڈگمگا گئے اور جب امرتسر جانے والا لاریوں کا قافلہ روانہ ہوا تو اس میں میں بھی سوار تھا۔ مجھے الوداع کہنے کچھ مسلمان دوست بھی آئے تھے۔ ان میں سے دو ایک کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ایک ہمسفر نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا، ''سالے پہلے مار مار کر بھگاتے ہیں پھر روتے ہیں۔'' مجھے غصّہ آگیا اور میں نے کہا، ''بَکو مت۔'' یہ فیصلہ میں آج تک نہیں کر سکا کہ یہ جھاڑ میں نے اسے ڈالی تھی یا خود اپنے آپ کو۔ کیونکہ دل اندر ہی اندر کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا کہ قلندروں کو جُل دے کر جا رہا ہوں۔

قافلہ امرتسر پہنچا تو وہاں بھی جَلے ہوے مکان نظر پڑے۔ لاہور میں پیشانی پر نورِ شہادت پیدا نہیں ہوا تھا لیکن یہاں آکر ندامت کے قطرے ضرور نمودار ہو گئے۔

پتہ چلا کہ اسی قافلے میں راج بلدیو راج بھی شامل ہیں۔ جہاں قافلہ رکا تھا وہاں اچّھا خاصا بازار لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں ہاتھ منہ دھو کر چائے نوشی میں مصروف ہوگئے۔ قافلے والے لُٹ لٹا کر آئے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لٹیرے خود ان میں بھی موجود ہیں۔ کسی کا ٹرنک غائب تھا کسی کا بستر۔ ہم اس پر طنزیہ انداز میں تبصرہ کر رہے تھے کہ قریب ہی سے آواز آئی، ''اب لاہور پر حملہ کرنے چلیں گے۔'' میں نے پوچھا، ''راج! ہم حملہ کرنے کب جا رہے ہیں؟'' کہنے لگا، ''بھئی، کبھی مشاعرہ پڑھنے چلیں گے۔'' [صفحہ ۱۱٦ تا ۱۱۹]

(بشکریہ گوپال متّل، ''لاہور کا جو ذکر کیا'' [دہلی: مکتبۂ تحریک، ۱۹۷۱])